

کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

یہ اس کتاب کا ایک باب ہے جو مولانا امین احسن صاحب نے ”حقیقت شرک“ کے نام سے

حال میں تصنیف فرمائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عنقریب شائع ہو جائے گی۔

اس زمانہ میں ہر علم و فن کی تحقیق میں نظریہ ارتقار ریڑھ کی ہڈی ہے۔ نایب ہو یا قانون، معاشیات ہو یا سیاسیات، فلسفہ و مذہب ہو یا علم عمران و تمدن ہر ایک کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کا شوق اس عہد کے ذوق پر اس درجہ غالب ہے کہ اسکے بغیر علم ادھورا اور ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر علم کا مدقن سرمایہ جو پوری روشنی میں موجود ہے، اپنی صحیح قدر و قیمت بتانے کے لئے بالکل ناکافی بلکہ اکثر حالات میں غلط اور مہمل قرار دیدیا گیا ہے۔ آج اصل شے یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس عہد میں تحقیق کی جائے جبکہ انسان بالکل عہد طفولیت میں تھا اور سبکی کوئی لکھی ہوئی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہد ایک عہدِ ظلمت ہے۔ اسکے متعلق جو کچھ بھی کہا جاسکتا ہے اسکی حقیقت رجا بالغیب باتوں اور احوال کے تیرنگوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس ظلمات میں خضر راہ آر کیا بوجی و علم الاثار، اور بیالوجی (علم الجوۃ) کے ماہرین ہیں جو زمین کے طبقات، پتھروں کے پرتا عاروں کے اندر کے آثار و علامات، گڑی ہوئی ہڈیاں، ابتدائی آلات و اوزار اور قدیم انسان کے کھنچے ہوئے آڑے ترچھے نقوش کو علم کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور اس پر ظن و تخمین کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ اسکی حیثیت ظن و تخمین (GUESS WORK) سے زیادہ نہیں ہے۔ تاہم اسکی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ہر علم و فن میں وہی حقیقت ہے جو ان مظنونات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ جو بات ان سے میل نہ پیدا کر سکے وہ بے اصل اور ارتقار کی راہ میں گویا ایک غیر فطری بیرونی مداخلت ہے جسکے وجود نہیں بلکہ عدم

مطلوب ہے۔ اس خیال کے غلبہ کا یہ اثر ہے کہ ایک عرصے دنیا میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے جتنے دعوے اُبھرے ہیں ان میں سے ہر دعویٰ کو نظریہ ارتقاء کا سہارا لینا پڑا ہے۔ اور یہ اتنا مرخان مرغ واقع ہوا ہے کہ سب کے ساتھ اسکی سازگاری رہی جمہوریت کے حامیوں نے انسان کی ابتدائی سماجی زندگی کا نقشہ اس طرح پیش کیا کہ جمہوریت ہی کو انسان کا فطری تقاضا ثابت کر دیا۔ نوکیت کے ہمدردوں نے اس کی تقریر اپنے رنگ میں کر ڈالی مزاج کے علمبرداروں نے اسکی تصویر اپنے رنگ میں کھینچ دی۔ اشتراکیت نے اس کو اپنے رنگ میں پیش کر دیا۔ صرف غریب مذہب اس سے متاثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کلیسا سے پہلے ہی مرحلہ میں اس نظریہ کے علمبرداروں کے ان بن ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکے شاطرحامیوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح بھی اس کو ان مذاہب کی حمایت میں نہ استعمال کیا جاسکے جو اپنی مخصوص انفرادیت کے مدعی ہیں اور اپنے عقائد و مسلمات کی بنیاد وحی پر قرار دیتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے ساتھ کسی رواداری کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی جڑا کھاڑنے کی انہوں نے پوری کوشش کی اور اس مقصد کے لئے مذہب کے ارتقاء کو انہوں نے اس طرح پیش کیا جس سے آسمانی مذاہب کے تمام مسلمات بالکل ٹھسے جائیں۔

اس مضمون میں سہل کی تمام تفصیلات سے یہیں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف اتنے حصہ سے تعرض

کرینگے جس کا تعلق شرک و توحید سے ہے۔

یہ لوگ مذہب کے ارتقاء کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ مذہب نے انسان کے اولین نقش قدم کے ساتھ دنیا میں قدم رکھا جس وقت انسان نے یہ محسوس کیا کہ وہ مجرد جسم نہیں ہے بلکہ اپنے اندر اس سے ایک برتر عنصر روح بھی رکھتا ہے اسی وقت مذہب کی پہلی بنیادی اینٹ رکھ دی گئی اس کی ابتدائی تشکیل دو عنصروں سے ہوئی۔ ایک جذبہ خوف دوسرا تصور۔ خوف ان دیکھی قوتوں کا جو قدرت کی ان طاقتوں سے پیدا ہوا جو انسان سے زور و قوت میں بڑھ کر تھیں اور ہر چہا طرف سے اس کو گھیرے ہوئے تھیں اور تصور اس بات کا کہ ان کی تعظیم اور بندگی کرنی چاہئے۔ جس طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ، جو جسم و جسمانیات سے تعلق رکھتی ہیں زندگی کے اس ابتدائی

ذره سے وابستہ ہے جس نے مادہ کو زندگی کی حرکت بخشی اسی طرح ان تمام چیزوں کی تالیف، جو روح و روحانیات سے وابستہ ہیں، اس ذرہ روح سے متعلق ہے جس کے جذبہ خوف اور تصور کے باہمی تفاعل سے مذہب وجود میں آیا ہے۔ اس مذہبی تصور نے جب مذہبی عمل کی صورتیں اختیار کیں تو اسکے نتیجے کے طور پر مذہب کے فرائض اور اسکے رسوم و مناسک وجود میں آئے۔ پس مذہب ایک عمل ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کا ارتقاء تھا۔ یہ روح کا ارتقاء ہے۔ اور جس طرح یہ بات معلوم ہے کہ زندگی ایک زمانہ میں رہنے والے جانوروں کی شکلوں (REPTILION

LIFE FORMS) میں چھپی ہوئی تھی اور درجہ بدرجہ انسان کی اس آسن تقویم میں بے نقاب ہوئی، اسی طرح روح ابتدا میں مظاہر پرستی، اشیاء پرستی اور سحر و ساحری کی زنجیروں میں گرفتار تھی اور آہستہ آہستہ خالص خدا پرستی پہنچی اس تقریر سے جو نتائج وہ نکالتے ہیں وہ بھی ہم اپنے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔

۱۔ مذہب کا نقطہ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ یہ خوف مظاہر قدرت سے پیدا ہوا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کھانک، آندھیوں کے شور، آتش فشاں پہاڑوں کے ہونک نظاروں نے انسان کو ڈرایا اور وہ ان کو زندہ وجود سمجھ کر ان کی آفتوں سے اپنے تئیں بچانے کے لئے ان کی عبادت کرنے لگا۔

۲۔ خالص خدا پرستی کے تقاضائے فطرت ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا پرستی کی جگہ انسان مظاہر پرستی اور اشیاء پرستی وغیرہ سے پہلا قدم نہ اٹھاتا اور نہ دنیا میں بت پرستی اور مردہ پرستی کی یہ کثرت ہوتی۔

۳۔ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اس اعتبار سے اسلام اور یہودیت اور افریقہ کے وحشیوں کی سحر پرستی (VOODOO WORSHIP) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پس تمام مذاہب اور عقائد مختلفہ میں رواداری کو اصل الاصول ہونا چاہئے۔

ادھر کی تقریر اس قدر دلکش تھی کہ ان نتائج کا لحاظ کئے بغیر، اس نے ہمارے حال کے بعض علمائے دین کی کتابوں میں بھی جگہ پالی۔ حالانکہ ہے یہ بالکل مہمل اور غلط۔ عقل و نقل دونوں اسکے خلاف ہیں۔ یہ بات کہ مذہب کا آغاز ان دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا بالکل بے سرو پا ہے۔ انسان میں جو خوف ہے

اس کی اصل حقیقت زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے۔ (چنانچہ اہل جنت کو یہ نعمت حاصل ہوگی کہ لا خوف علیہم ولا هم یحزنون نہ ان کو زوالی نعمت کا اندیشہ ہوگا نہ فاسد کا غم) اس لئے خوف سے پہلے نعمت اور منعم کا شعور ناگزیر ہے جب تک ہمیں زندگی اور اس کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک ہمیں زندگی کے متعلق کوئی خوف نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی سے ہزار ہوں جاتے ہیں وہ موت جیسی خوفناک چیز سے بھی نہیں ڈرتے۔ کتنے آدمی آگ میں کود پڑتے ہیں کتنے دریاؤں اور سمندر میں ڈوب مرتے ہیں اور جاپان میں کتنے ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں چھلانگ لگا کے ختم ہو جاتے ہیں۔ پس اگر ابتدائی انسان کو بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور طوفانوں کے شور سے کوئی خطرہ محسوس ہوا اور اسے اپنے تئیں ان کے خطرات سے بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو اس سے لازم آتا ہے کہ اسے زندگی اور زندگی کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا شعور تھا کیونکہ جب تک کوئی شے عزیز نہ ہو اس کی حفاظت کی فکر بالکل بے معنی ہے۔ خالی گھر میں کوئی بھی قفل نہیں لگاتا۔ اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اسے ایک منعم کا بھی شعور تھا کیونکہ نعمت کا وجود ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے۔ اور اگر یہ بات بھی ہے کہ وہ قدرت کے ان مظاہر کی اس ڈر سے عبادت کرنے لگا کہ وہ اس سے کہیں زندگی کی نعمت یا اسکے اسباب چھین نہ لیں تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان نعمتوں کے شعور نے اس میں اپنے منعم کے لئے محبت کا جذبہ بھی پیدا کیا ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ ایک منعم کی محبت کا جذبہ خوف کے جذبہ پر مقدم ہے بہر حال انسان نے جب سے خوف کا احساس کیا اس سے پہلے زندگی کے نعمت ہونے اور ایک منعم کا اور اس کی محبت کا احساس کیا اور جس وقت اسکے تصور نے درغلا یا کہ ان مظاہر قدرت کی عبادت کرے یقیناً اس سے پہلے جذبہ محبت سے ایک تصور نے ابھر کر اسے اکسایا ہوگا کہ وہ اپنے منعم کا شکر کرے اور لاریب یہی محبت اور شکر گزاری کا جذبہ و تصور توجید اور خالص خدا پرستی کی اصل ہے۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید نے حمد و شکر کو انسان کی اولین صدائے فطرت بتایا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم۔

اس بات کی تائید اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں

وہ دنیا کے عامۃ الورد و واقعات میں سے نہیں ہیں۔ زلزلے روز نہیں آتے، آتش فشاں روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روز مرہ کا واقعہ نہیں ہے۔ لیکن تارے روز چمکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، آسمان کی نیلگوئی ہر لمحہ باصرہ نواز ہے۔ چاند رو پہلی چاندنی کی چادر، دشت و جبل میں روز بچھاتا ہے، ابر کرم کی تر دستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہر قدرت کی گاہ گاہ کی گھڑکیاں اور دھکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعم غیب کی یہ سب فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جاتیں اور انسان میں شکر و سپاس کا کوئی ولولہ نہ پیدا کریں۔

بیالوجی کے علمائے اس زمانہ کی دنیا کی تصویر بہت بھیانگ کھینچی ہے اور دکھانا چاہا ہے کہ اس وقت کے قدرتی مظاہر خوف کے جذبہ ہی کا باعث ہو سکتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس زمانہ کا انسان بھی آج کا انسان نہ تھا۔ اگر اس وقت یہ کائنات اتنی حسین نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی اتنا جمال پرست نہ تھا۔ اگر سو وقت یہ زمین آج کی طرح زرخیز و معمور نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی آج کی طرح عشرت پسند اور مجلس نواز نہ تھا۔ اگر اس وقت خطرے بے شمار تھے تو آج کے انسان کی طرح اس عہد کا انسان نازک بدن اور تن آسان بھی نہ تھا۔ وہ ہر خطرے سے بچاؤ کے لئے کوسوں بھاگ سکتا تھا، گلہریوں اور بندروں کی سی چستی کے ساتھ درختوں پر چڑھ سکتا تھا، آگ جلا کر اوپتے سی کر اپنے جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچا سکتا تھا، برف اور درندوں کی آفتوں سے بچنے کے لئے غاروں میں چھپ سکتا تھا، بھوک میں ہر جاندار کے شکار سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس لئے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس وقت کے حالات خوف ہی کے جذبہ کی نشوونما کے لئے سازگار تھے۔ اس میں حاضر کو ماضی میں داخل کر دینے کا مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ زمانہ قدیم ترین دور حجری سے بھی پہلے کا فرض کیا گیا ہے اور انسان اس کا اندازہ اس بیسویں صدی کا فرض کر لیا گیا ہے۔ بہر حال ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ انسان کے اندر جب بھی خوف کا جذبہ پیدا ہوا اس سے پہلے ایک منعم کی محبت کا جذبہ ضرور اس کے اندر موجود تھا۔

بعض علمائے ارتقار نے خاندان کے بڑے بوڑھے کے خوف کو انسان کے تمام ابتدائی تصورات (EARLY

(THOUGHTS) کی اصل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ باپ کے خوف کی بنیاد ضرور سانی کے اندیشہ پر نہیں ہے۔ اس کی بنیاد بھی محبت ہی پر ہے۔ بچوں کو تمام لذتیں اور راحتیں ماں باپ سے حاصل ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس محبت ہی کی وجہ سے ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ اس باب خاص میں قدیم ترین انسان اور جدید ترین انسان میں فرق کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ پس یہ جذبہ بھی درحقیقت محبت ہی کا جذبہ ہے اور اس سے بلاشبہ ماں باپ کی تعظیم کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ بچہ جب تک بچہ رہتا ہے اسی وقت تک ساری کائنات باپ ہی کو بھکتا ہے لیکن جوں ہی وہ خود باپ بنتا ہے یا بننے کے قابل ہوتا ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ باپ کا وجود صرف ایک تک ہی اس کی لذتوں اور راحتوں کا کفیل ہے اس حد سے باہر قدم رکھنے کے بعد اسے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کا سرچشمہ کوئی اور ہی ان دیکھی ہستی ہے۔ یہاں تک کہ خود باپ کا وجود بھی اسے ان دیکھی ہستی کی بے پایاں بخشائشوں میں سے ایک بخشش معلوم ہونے لگتا ہے۔ پس جذبہ محبت نے اسکے اندر باپ سے محبت، تعظیم اور خوف کی وابستگی پیدا کی ہوگی اگر انسان ہمیشہ بچہ ہی رہتا اور مذہب کا وجود اس کے جذبہ محبت اور تفاعل کا نتیجہ ہوتا تب تو دین کا آغاز پیدا ہوتی ہی سے ہوتا لیکن مشکل تو یہ ہے کہ بچہ میاں بھی ہوتا ہے اور مذہب کی ایجادیاں ہی کی کارفرمائی ہو سکتی ہے تو میاںوں کے جذبات اور تصور کا بھی کچھ نتیجہ ہونا چاہئے۔ بہر حال باپ کے احسانات کا اثر اگر محبت کے جذبہ کی شکل میں ابھر سکتا تھا اور اس سے اس کی تعظیم اس کے وقار اور اس کے احترام کا تصور پیدا ہو سکتا تھا تو اس سے بدرجہا اقرب ہے کہ ان عظیم احسانات کا اثر بھی اسی جذبہ و تصور کی شکل میں ہو جن میں باپ کو کوئی دخل نہیں تھا لیکن وہ موجود تھا اور باپ کے ہیں طرہ کسی ہر و محبت الٰہی ہستی کے ہوئے تھے

۱۔ مذہب کی اصل کے متعلق علماء سائنس کا مقبول عام نظریہ یہی دو ہیں اور اپنی کوفتہ علمی انداز میں پیش کر سکی کوشش کی گئی ہے اسی وجہ سے ہم نے بھی ان ہی دونوں سے تعرض کیا ہے۔ ورنہ اسکے علاوہ اور بھی نظریات ہیں مثلاً بعضوں نے مذہب کا نقطہ آغاز طوطیت (TOTEMISM) کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی اصل دل اول انسان پر کسی فسیلی چیز کے استعمال کے وجہاً نگر اثر کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی بنیاد جنسی خواہشوں پر رکھی ہے لیکن ہرگز فریاد محتاج تو یہ نہیں

یوں اور اس جذبہ کے لئے اسے صرف اس کے بعد ایمان رکھتی ہے کہ اس کا جذبہ تعظیم اور خوف کی نوعیت بھی میاں کی ہوگی۔

بہر حال مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ سے نہیں ہوا، محبت کے جذبہ سے ہوا ہے۔ علمائے ارتقار کے یہ دونوں نظریے باطل ہیں۔ پہلی صورت میں خالص خدا پرستی کا جذبہ اور تصور مقدم ہے اور غیر اللہ کی پرستش ایک غیر فطری عارض کی طرح انسان کو محض سو فہم اور اپنی فطرت کی صحیح آواز سے غفلت کی وجہ سے لاحق ہو گئی اور دوسری صورت میں یہ ہونا چاہیے کہ انسان باپ کی محبت کا ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہنچ جائے۔ اس کے اس جذبہ کا فطری ارتقار صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ باپ سے مستغنی ہونے کے ساتھ ہی مجازی باپ سے حقیقی خالق تک پہنچ جائے اور اس کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت کرے اور باپ سے زیادہ اس کی تعظیم بجلائے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو وہ ارتقار کی اصلی شاہراہ پر ماریج کرنے کے بجائے کسی اندھی گلی (BLIND ALLEY) میں جا پڑا اور یہی اسی طرح کا غیر فطری جمود ہے جس کی مثالیں مادی زندگی کے ارتقار میں ملتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ قدیم ترین جذبہ والدین کی محبت کا جذبہ اور قدیم ترین تصور والدین کی تعظیم کا تصور ہے۔ اس جذبہ کی رہنمائی بچہ کو بلوغ کے بعد خدا کی طرف لے جاتی ہے۔ نہ کہ آبا پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور تورات میں خدا کی عبادت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت میں خدا اور والدین کے حقوق کا شعور قدیم ترین ہے۔ اور ان میں خدا کا حق والدین پر مقدم ہو جاتا ہے اگرچہ شعور میں والدین کا حق پہلے آتا ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے بلا خانے پر چڑھنے سے پہلے زینہ اوپر ہوتا ہے لیکن اس پر پہنچ جانے کے بعد زینہ نیچے ہو جاتا ہے۔ خدا تک پہنچ جانے کے بعد انسان پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ والدین خود خدا کے افضال میں سے ہیں ان کا پوجنا تو درکنار اس نعمت کے ملنے پر بھی خدا ہی کا شکر واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے والدین کے لئے بیٹے پر تمام حقوق تسلیم کئے لیکن ان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ بیٹے سے شرک کر لیں (وان جاهدوا للہ علی ان تشرکوا فی ما لیس لہ بہ علم فلا تطعہما) اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کے اندر جو داعیہ

حقوق والدین کے احترام اور ان کی محبت و تعظیم کے لئے ہے اس سے قوی تر داعی اللہ اور اسکے حقوق کے احترام کے لئے ہے پس والدین کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ جس جذبہ و تصور سے وہ ایک چیز پاتے ہیں بعینہ اسی جذبہ و تصور کے اس سے قوی تر مقصد کا خدا کے باب میں انکار کرائیں۔

بعض لوگوں کو ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں جگہ جگہ اہل ایمان کی تعریف میں تقویٰ، خشیت اور خوف کا ذکر آتا ہے۔ اس سے علمائے ارتقار کی اس بات کی تائید نکلتی ہے کہ مذہب کا نقطہ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ لیکن یہ شبہ بالکل غلط ہے۔ اسلام میں وہ خوف و خشیت معتبر نہیں ہے جسکی بنیاد مجرد ضرر و سانی کے اندیشہ پر ہو۔ اس طرح کی خشیت چنگیز، تیمور، شیر، مانتھی، سانپ، بچھوہر ایک سے ہو سکتی ہے۔ اگر یہ خشیت خدا سے ہو تو اسکی کیا وقعت ہے۔ مذہب میں جو خوف و تقویٰ مطلوب و محبوب ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ وہ خوف و تقویٰ ہے جس کی بنیاد محبت پر ہے۔ یہ مجرد خدا کے قہر و غضب کے تصور سے نہیں بلکہ اسکے بے پایاں افضال و عنایات کے تصور اور اس کے اسمائے حسنی کے تذکرے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اس کی اعلیٰ صفتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں وہی اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہی اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ انما ینحشی اللہ من عبادہ الصالحین۔ (اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں)۔

اس تقریر سے علمائے ارتقار کے اس نظریہ کی پوری تردید ہو گئی کہ مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ اور مظاہر پرستی سے ہوا لیکن ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت خالص خدا پرستی ہے اور اسکے روحانی ارتقار کا رخ یہی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا میں کثرت سے شہادت بت پرستی، مردہ پرستی وغیرہ ہی کی ملتی ہے۔ تاریخ کے عہدِ ظلمت کے آثار و قرآن بھی اسی کی گواہی دیتے ہیں اور جس عہد کا مدّقلن سرعاً یہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ نصاریٰ پر پوری چھ صدیاں بھی نہ گزرنے پائیں کہ ان میں تصور پرستی رائج ہو گئی حالانکہ تو دیت میں اسکی سخت ممانعت تھی۔ یہود باوجود کہ تو دیت

کا پہلا حکم توحید تھا، بار بار دل کھول کر بتوں کو پوجنے لگے۔ حضرت ابراہیمؑ نے محض توحید کے لئے وطن کو چھوڑا اور ایک سنان جگہ جایے لیکن انہی کی اولاد نے، بہت مدت نہیں گذری کہ اسی گھر میں بتوں کو لایسا یا جس کا معمار وہ پہلا بت شکن تھا۔ جبکہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خالص توحید ہی انسان کی فطرت ہے لیکن واقعات کی شہادت اسکے خلاف ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہے اور اسی جواب سے علمائے ارتقا کے اس دوسرے نتیجہ کی تردید ہو جائے گی جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

یہ بات کہ دنیا میں ابتداء سے کثرت بت پرستی اور شرک کی رہی ہے اور اب تک ہے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ شرک و بت پرستی انسان کی فطرت ہے۔ آدمی کا بچہ جب تک بچہ ہوتا ہے، سامنے کی ہر چیز بلا امتیاز اسکے کہ وہ اینٹ ہے یا پتھر، لکڑی ہے یا لولا، پاک ہے یا ناپاک، اس کو منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ ماں کی چھاتی ہے۔ کچھ دیر تک اس کو چوستا ہے۔ پھر کوئی دوسری چیز اٹھالیتا ہے، تیسری چیز اٹھالیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ ساری چیزیں بچہ کو فطرۃً مطلوب ہیں محض حماقت ہے بچہ کی فطری غذا ماں کی چھاتی کے اندر ہے اور اسی کی تلاش میں ہی یہ ساری ٹنگ و دو بھی ہے لیکن چونکہ ابھی اسکے اندر پورا امتیاز نہیں ہوتا وہ ہر چیز کو ماں کی چھاتی ہی خیال کرنے لگتا ہے۔ پس اگر انسان اپنے عہد طفولیت میں بت پرستی اور مظاہر پرستی وغیرہ کی بنیادوں میں آلودہ رہا تو اسکے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہی اسکی فطرت کا تقاضا تھا۔ درحقیقت اسکی یہ ساری پریشانی دسرگردانی معبود حقیقی کی تلاش میں تھی جس کی طلب نے اسکو ان تمام کچھوں کی خاک چھنوائی۔ بچہ کی یہ خصوصیت بھی قابل لحاظ ہے کہ بسا اوقات ماں اسکو پکارتی بھی ہے لیکن وہ جس چیز میں مشغول رہتا ہے اسی میں مشغول رہتا ہے تا آنکہ وہ اسے گود میں نہ اٹھالے اور اپنی چھاتی اسکے منہ سے نہ لگائے پھر جوں ہی اس کو سینہ سے الگ کر دیتی ہے وہ ہر چیز منہ میں ڈالنے اور ننگنے لگتا ہے۔

پس یہ بات بالکل مطابق عقل معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ کے عہد ظلمت میں بھی خدا کے ایسے بندے آئے جن کی فطرت بیدار تھی اور انہوں نے دوسروں کو بھی بیدار کیا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد جیسا کہ بچوں کی فطرت ہے،

کھلونوں کی دلچسپی عود کرتی رہی۔ اور انسان کی جستجو اپنا مدعا پاپا کے کھوتی رہی۔

یہاں پہنچ کر بعض لوگوں کو ایک اور شبہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو چیز انسان کی فطرت ہے چاہے کہ وہ سی

پر پیدا ہو، اسی پر مڑے اور اسی پر مرے۔ یہ پاپا کر کھونا اور کھوکھو کے پانا کیا معنی! کم از کم یہ تو ہو کہ جستجو

بسیار کے بعد جب پا جائے تو پھر اسے نہ کھوسکے، ایسبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ حیوانات کی جبلت

اور انسان کی فطرت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ حیوانات کی جبلت اپنے بندھے ٹنکے قاعدے رکھتی ہے، اگر

کوئی طبعی خلل نہ واقع ہو، انہی قاعدوں پر بڑھتی، لٹو و ٹا پاتی اور اپنے مقررہ درجہ کمال تک پہنچتی ہے۔ قدرت

نے انکو اس طے نخراف، اس میں تبدیلی یا اس میں ترقی کا کوئی موقع نہیں بخشا ہے۔ وہ اپنے ڈھرے کے پابند

اور اپنے طبعی نظام کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک کبوتر کو اگر آپ گوشت کی ایک دوکان کے اندر بند

کر دیں وہاں بھوکا مر جائے گا لیکن گوشت کے سارے ذخیرہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ ایک بٹی کو اگر

آپ پھلوں کی الماری کے اندر بند کر دیں وہ بھی بھوکا مر جائے گی لیکن پھلوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔

لیکن انسان کی فطرت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے استاذ امام کے الفاظ مستحاضا

لے لیتے ہیں جو انہوں نے تفسیر سورہ اخلاص میں مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھے ہیں۔ اور سورہ

روم کی آیات (۲۸-۴۴) کی روشنی میں لکھے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :-

۳. حکمت اور رحمت کی نشانیان جو انسان کو تمام عالم میں نظر آرہی ہیں اہا اپنے رب کی طرف کشش سے وہ

مصیبت کے وقت غمگین کرتا ہے، بتا رہی ہیں کہ کسی حاکم مطلق کی ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے

گواہی مل رہی ہے۔ ایسی کوئی شہادت بتوں یا مردوں کے لئے نہیں ملتی۔ مگر انسان کی فطرت مثل اور

حیوانات کے نہیں۔ وہ غلام بنائے گئے اور اس کو انادی بخشی گئی جس کا لازم تھا کہ وہ اپنی کوشش سے

ترقی کرے پس ان کو جس ڈگر پر چلانا تھا مانک دیا اور وہ ویسے ہی چل رہے ہیں مگر انسان کو چنانچہ عقل

اور توشہ قابلیت دے کر میدان عالم میں چھوڑ دیا پس اسکی فطرت اس کی قابلیت ہے۔ جس قدر انسان نے

آج تک ترقی کی ہے یہ سب اس کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اس کی قابلیت ہی کے برگ و بار۔ یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہے کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں بچہ طوائف جو ایک مضمحل گوشہ نشین ہے جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گھمادی کو ہم اس کی فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچہ انسان جو اکثر جانوروں کی نسبت زیادہ ضعیف الہنہ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ضعیف العقل ہے جب اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو کیا اسکی ادنیٰ ادنیٰ کادرتوانائی کو ہم اسکی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں۔ پس انسان اور دیگر چیزوں میں فطرت کے ایک ہی معنی ہیں البتہ اس کی فطرت میں ایک جداگانہ بات ہے جو جانوروں میں نہیں۔ یہ اولیٰ میں نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے مگر آخر میں سب پر فائق ہو جاتا ہے۔ اسکی طاقت کی تقاضا اب تک نہیں ملی۔ مگر یہ سب دونوں توانیوں کے درمیان ہے مگر ایسا نہ ہوتا تو انسان سے دعوائے فرعون بھی ناموزوں نہ ہوتا پس محض اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کے لیے انتہا مراحل طے کرتی ہے یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑ جائے۔ پس آنا دی راستے اور پھر درازی راہ اس کے حصہ میں آئی۔ ان دونوں مشکلوں کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی جو ان دونوں سے کہیں جدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان نیکی اور بدی کے دو راہ پر کھڑا کیگی جس کے بغیر اسکے حق میں آزادی لفظ بے معنی ہوئی اور ترقی مراتب کے لئے عرصہ تنگ ہوتا۔ پس کوشش اور کشش انسان کی فطرت کا لازماً زہم ہوا اور نیکی اور بدی کی کشش میں آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آفکارہ کو جادہ طاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔

انسان کو خدا تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دستگیری کا وعدہ کیا ہے۔ اسکے اندر اور باہر سامان ہدایت موجود کرتے ہیں۔ جس طرح بچہ ناتواں کے لئے ماں کا آغوش ہتیا کیا اسی طرح انواع انسان کے لئے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ جو خدازمین مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے وہی خدا اپنے کلام سے دلوں کو آباد کرتا ہے جس طرح وہ بعضے بلند پہاڑوں میں سے قدرتی چشمے نکال دیتا ہے اسی طرح بعض اعلیٰ دلوں میں سے الہی کلیے جاری فرماتا ہے پس اس قدر سامان ہتیا کر جینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگرداں ہو

تو یہ نتیجہ فطرت نہیں بلکہ اس کی غفلت ہے۔ اگر تاریخ سے بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ پُر زور اسکے ابطال کی مثالیں ملتی ہیں۔ توحید پر شرک کا غبار آہستہ آہستہ جتنا ہے مگر توحید کا ذرا سا چمکا لائے شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرت انسانی کو توحید سے مناسب ہے ورنہ وہ کیوں اس طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے؟

اس تقریر سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی جبلت میں چند بنیادی فرق ہیں پہلا فرق یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ فطرت اور اعلیٰ اخلاق کے ساتھ آزادی بھی ملی ہے۔ اس آزادی کی وجہ سے وہ اگر چاہے تو حسن تقویم میں ہونیکے باوجود اسفل سافلین کی حقیقتِ ذلت میں گر جائے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کی قوتیں اور قابلیتیں اتناہ ہیں۔ اس کو ترقی کی ایک لمبی منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ حیوانات کی طرح اس کا راستہ کوس دو کوس کا نہیں ہے کہ چلے اور پہنچ گئے۔ اس درازی راہ اور آزادی رائے کے ساتھ اس کا گنا اور گناہ ڈوبنا اور اچھلنا بالکل قدرتی بات ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ آزادی رائے اور درازی منزل کے ساتھ ساتھ اس کی آزمائش بھی گئی ہے۔ اسکے سامنے دنیا کو نقد، آخرت کو نسیہ، نیکی کو دشوار، بدی کو آسان، حرام کو لذیذ اور کثیر اور حلال کو بے مزہ اور قلیل، ثمرہ حق کو آجل اور نتیجہ باطل کو عاجل، حقیقت کو مستور اور وہم و فریب کو دلکش اور پُر جمال بنا کر رکھ دیا گیا ہے تاکہ اس کا امتحان ہو کہ وہ خیر کی طرف لپکتا ہے یا شرک کی طرف۔ اپنی فطرت کے معنی مگر پُر حقیقت اشاروں کی طرف بڑھتا ہے یا نفس کی خلاف فطرت مگر پُر فریب دعوتوں کی طرف بلاشبہ یہ امتحان بڑھ کر ہے لیکن فطرت کا نفس تو ہم بھی ضعیف نہیں ہے۔ وہ ہر تار کی کے اندر جھانکنے کی راہ پیدا کر لیتا ہے اور انسان کی رہنمائی کے لئے اشارے کرتا ہے اور آدمی محسوسات کے کتنے ہی نقاب اپنے اوپر ڈال لے لیکن اسکے اشارے دیکھتا اور اس کی صدا میں سنتا ہے لیکن نفس اور محسوسات کی گیرائیاں اسکو چھوڑتیں نہیں۔ اور وہ خدا کی صدا میں سنتے ہوئے بھی اسکی نافرمانیاں کرتا اور اسکی جھوٹوں کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے لئے عذرات تراش ہی لیتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو سورہ قیامہ کی آیات (ولا اقسم بالنفس اللوامة) لے اور نہیں میں تمہارا ہوں نفس ملامت گری۔

(بل یزید الانسان لیفجر امامہ) اور (بل الانسان علی نفسه بصیرۃ ولولاعقوب
 معاذیوۃ) میں بیان ہوئی ہے اور تفصیل اس اجمال کی استاذ امام کی تفسیر پر سورہ قیامہ میں دیکھنی چاہیے۔
 امتحان کی سختی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کی رہنمائی کے لئے انبیاء مبعوث فرمائے۔
 ہر خیز فطرت کی کشش خدا کی طرف ضعیف نہیں تھی لیکن دنیا اور اس کی گیرائیوں نفس اور اس کی غریب کاریوں
 شیطان اور اس کی دلربائیاں بھی اپنے اندر اتنا وزن رکھتی تھیں کہ رحمتِ الہی مقتضی ہوئی کہ اس کسر کا جبر
 ہٹایا کرے اور نفس کے پہلو پر جو نقل ہے اس کی تلافی فطرت کے پڑے میں پانسگ رکھ کے کرے۔ چنانچہ
 قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو شیطان کے ساتھ اس آزمائش گاہ دنیا میں اتارا تو ساتھ
 ہی اپنی ہدایتیں اور اپنے انبیاء بھیجئے گا وہ فرمایا (فامّا یا یتیمکم متّٰی ھدی) تاکہ اس میدانِ مقابلہ
 میں انسان کی فطرت تنہا نہ پڑ جائے بلکہ اسکے ساتھ اللہ کے نبیوں، اس کی کتابوں اور اسکے ملائکہ کی نصرت بھی
 ہو۔ یہ فطرت کی تائید میں ایک مزید کمک تھی جس کے بعد انسان پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور اسکی ہدایت کا
 معاملہ اتفاق و امکان پر نہیں رہ گیا۔ اب اس کے لئے قیامت کے دن یہ عذر باقی نہیں رہا کہ تاریکی اتنی سخت
 تھی کہ اس سے اپنی فطرت کے مدہم نقوش پڑھے نہ جاسکے۔ بلاشبہ تاریکی سخت تھی لیکن نورِ مبین اور سراجِ منیر
 بھی موجود تھے جو فطرت کے ہار یک سے ہار یک نقوش کو اجاگر کر رہے تھے۔ قدرت کسی گوشہ میں بھی اپنی فیض
 بخششوں میں بچیل نہیں ہے۔ یہ ممکن تھا کہ انسان کو سننے کے لئے ایک ہی کان دیا جاتا، یا دیکھنے کے لئے ایک ہی آنکھ
 ملتی لیکن قدرت نے دو کان بچنے اور دو آنکھیں عنایت کیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ انسان کی رہنمائی اسکی
 فطرت ہی پر چھوڑ دی جاتی لیکن رحمتِ الہی نے اس معاملہ کو امکان و اتفاق پر نہیں چھوڑا بلکہ اپنے نبیوں اور
 رسولوں کے ذریعہ سے ہدایت کا بہتر سے بہتر سامان مہیا کر دیا۔ اندر اور باہر کی اتنی قوتیں رکھنے سے باوجود
 اگر انسان خدا پرستی کی حمایت میں شیطان سے لڑنے کے لئے تیار نہ ہوا بلکہ اس کے ساتھ اس نے سازگاری
 لے بلکہ انسان چاہتا ہے کہ خدائے سامنے نافرمانی کرے۔ لہذا انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ کتنے ہی عذرات پیش کرے۔

ہی چاہی تو ظاہر ہے کہ یہ فطرت کی خرابی نہیں ہے بلکہ اسکے اسباب دوسرے ہیں جو انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ آئندہ فصل میں بیان ہونگے۔

اس تقریر کے بعد اس بات کی تردید کی ضرورت نہیں رہی کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کا نقطہ آغاز خوف کا جذبہ نہیں بلکہ محبت الہی کا جذبہ ہے اور شرک و بت پرستی کی بنیاد ایک باہل دوسری ہی شے پر ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پس اسلام اور تمام مذاہب حقہ کا اصلی نام اسلام ہے اور یہی ابتدائے آفرین سے خدا کا اصلی دین ہے (اور شرک و بت پرستی میں اصل و نسل کا فرق ہے۔ اور ان کا قدرتی تعلق صلح و آشتی کا نہیں بلکہ نفرت و عداوت کا ہے۔ ایک فطرت کا ارتقار ہے دوسرا فطرت کی رجعت قہقری۔ دونوں کی سمت سفر اور منزل بالکل مختلف ہے ان میں رواداری اور مسالمت کی کہاں گنجائش ہے)

دنیا میں انسان محض جینے نہیں آیا ہے۔ اس لئے آیا ہے کہ اس کی فطرت میں جو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت ہیں ان کو ارتقار کے اس نقطہ کمال تک پہنچائے جہاں تک وہ اس عالم آب و گل میں پہنچ سکتی ہیں۔ اسی مقصد کے لئے انسان کو دنیا میں جینے کی ایک مہلت ملی ہے اگر یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کا جینا لا حاصل اور اس کا زندہ رکھنا عبث ہے اور قدرت جو ہر گوشہ میں اتنی حکیم ہے وہ ایک کارِ عبث نہیں کر سکتی۔ انسان کے ارتقائے روحانی کا نقطہ آغاز جیسا اوپر معلوم ہو چکا ہے خالص خدا پرستی کا جذبہ ہے۔ جب انسان اس رُخ پر بڑھ چلتا ہے تو وہ ارتقائے روحانی کی اصلی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے اس رُخ پھیر لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارتقائے فطری کی راہ کے خلاف بہ چلا ہے۔ چونکہ قدرت حد درجہ مہربان ہے اس لئے اس نے فطری ہدایت بخشنے کے باوجود اس کا سامان کیا ہے کہ وہ اپنے انبیاء و رسل بھیجتی ہے جو انسانوں کو ان کے ارتقار کی صحیح سمت میں لائے ہیں یعنی ان کو خالص خدا پرستی کے نقطہ تک لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جس جماعت کے داعی ہوتے ہیں اسکے نخل فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں۔ بہترین

سیرت رکھتے ہیں، بہترین کام سنا تے ہیں، بہترین عمل دکھاتے ہیں اور ایک طویل مدت تک ایک اعلیٰ ترین فطرت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہترین جماعت تیار کر دیتے ہیں جو فطری ارتقار کی اصلی شاہراہ پر اپنا مارچ شروع کر دیتی ہے۔ اب اسکے بعد بھی اگر کچھ بلید ایسے ہیں جن کے کان فطرت کی صدوں اور نبی کی نداؤں سے بالکل غافل ہیں تو ان کو قدرت کس کام کے لئے باقی رکھے! محض جینے کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کے لئے تو انسان بنانے کے باوجود، انہیں چھوڑنے سے رہی۔ اس کے لئے تو حیوانات موجود ہی ہیں جو یہ سارے کام بھی کر سکتے ہیں اور اپنے سے برتر نوع کی خدمت کر کے ارتقار کی شاہراہ پر بڑھ بھی رہتے ہیں۔ ہدایت کے لئے جو جتن کئے جاسکتے تھے وہ کئے جا چکے۔ اب صرف یہ چیز باقی رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے یا تو حقائق کے تمام پردے اٹھا دے اور انہیں تمام عالم غیب و شہادت کی سیر کرانے یا ہدایت پر مجبور کر دے لیکن یہ اکراہ اور کشف حجاب اس آزادی اور سنت ابتلا کی نفی ہے جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں تو اب قدرت ان کو کس کام کے لئے جینے کی مہلت دے! یہ انسان بجز اسکے اب کیا کرے گا کہ جس غلط راہ پر خود چل پڑا ہے اسی پر ان کو بھی چڑائے گا جن پر اس کا قابو چلے گا اور ان کو بھی جو اس کی صلبت پیدا ہو گئے۔ (ان تذر ہم ریضنوا عبادک ولا یلدوا الا فاجر اکفرا) اسی لئے سنت اللہ یہ ہے کہ جن قوموں کے اندر انبیاء و رسل بھیجے گئے تھیں دعوت اور تمام محبت کے بعد انکے صالحین کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا اور فاسقین و اشرار کو عذاب الہی کے ذریعہ سے یا اہل حق کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا اور بقائے اصلح کا قانون اسی کا مقتضی ہے۔

یہ سنت اللہ انبیاء کے لئے مخصوص ہے اور اس کے متعین ضوابط ہیں جو قرآن حکیم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور استاذ امام کی تفسیر سورۃ کافرون میں اس پر اجمالی اشارات ملیں گے۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے اشخاص اور جماعتیں اس درجہ کا تمام محبت نہیں کر سکتے کہ یہ طے ہو جائے کہ اب اس قوم میں قبول ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی اس لئے ان کو یہ حق نہیں ملا کہ وہ غیر صالح افراد کو ختم کر دیں الا انک

ایک شخص نے قبول ہدایت کے بعد رجعت و ارتداد اختیار کیا ہو۔ کیونکہ اس کا ہدایت کو قبول کرنا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس پر حق روشن ہو چکا ہے۔ ان کو غیر صالح افراد کے باب میں صرف یہ حق ملا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے قیادت کی باگ چھین کر ان کو اپنی ماتحتی میں رکھیں تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلانے کی بجائے ایک صالح قیادت میں رکھ کر اور ایک سازگار ماحول میں پل کر، اگر کچھ گنجائش ہے تو اپنی اصلاح کر سکیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مذہب کا آغاز محبت کے جذبہ سے ہوا جو بچہ کی فطرت میں والدین کے لئے اور بالغوں کی فطرت میں والدین کے سوا ایک منعم حقیقی کے لئے پیدا ہوا۔ اس محبت سے منعم حقیقی کے لئے شکر و حمد کا اور والدین کے ساتھ احسان کا جذبہ پیدا ہوا۔ منعم حقیقی کی حمد کے جذبے نے اقبال الی اللہ کا تصور پیدا کیا جس نے نماز کی صورت اختیار کی اور والدین کے ساتھ احسان کے جذبے نے ان کی خدمت اور ان کے لئے انفاق کا تصور پیدا کیا جس نے ترقی کر کے ایثار و فی القربى اور زکوٰۃ کی شکل اختیار کی۔ اس طرح روح انسانی کا ارتقاء شروع ہوا اور حقوق اللہ کی ادائیگی کے تصور نے تمام عقائد و عبادات کو اتوار کیا اور حقوق العباد کی ادائیگی کے تصور نے تمام اخلاق و معاملات کو استوار کیا۔ یہ فطرت اور خدا پرستی کی صراطِ مستقیم ہے۔ یہی ارتقاء روح کی اصلی شاہراہ ہے۔ اسکے ایک سرے پر ابونا آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے سرے پر خاتم الانبیاء رسول اللہ صلعم اور اسکے بیچ میں وسط راہ پر خدا کے ہزاروں ناکھوں انبیاء و رسل اور دعاۃ حق ٹھوڑے ٹھوڑے فاصلے سے کھڑے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اسی راہ پر چلنے کی دعوت دی لیکن انسان باز بار بار اس راہ پر آکر اس سے منحرف ہوتا رہا اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی پیدا کرتا رہا۔ چنانچہ ہر نبی کو یہ کہنا پڑا کہ لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها۔ زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی مت پیدا کرو۔